اموالِ حرام کا مصرف

یعنی بینکوں وغیرہ کے منافع کو کہاں استعمال کیا جائے؟

فتویٰ: ڈاکٹر یوسف القرضاوی

مترجم: حافظ عبدالرب سرہندی

ایک سائل نے جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی کا ایک مقالہ پڑھا جو بینکوں کے سود سے حاصل کیے ہوئے مال کے بارے میں تھا کہ وہ حرام ہے۔ اس پر سائل نے خود اپنے اور عامۃ المسلمین کے استفادہ کے لیے ان کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

میں نے آپ کا مضمون بعنوان ''بینک کا منافع حرام اور سود ہے'' پڑھا اور میں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ نیز فقہائے کرام کے اقوال کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ اب میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ میں حلال ہی کو ترجیح دوں اور حرام سے بچوں' پاکیزگی اختیار کروں' گندگی سے دُور رہوں' نیز شک کے بجائے یقین کو اپناؤں۔ درحقیقت حلال کم بھی ہو تو برکت لاتا ہے اور یہی دنیا وآخرت میں بہتر ہے اور فائدہ مند بھی اُس حرام سے جو بظاہر مقدار میں زیادہ نظر آئے۔

اب میرا سوال اس منافع کے متعلق ہے جو بینکوں میں جمع ہے' اس کا میں کیا کروں؟ کیا میں اس کو بینک ہی میں چھوڑ دوں کہ وہ جو چاہیں کریں' یا میں خود لے کر حکومت کی طرف سے عائد کردہ ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی وغیرہ ادا کرنے میں صرف کر دوں' یا پھر گیس اور پٹرول کا خرچ اس سے چلاؤں' جیسا کہ بعض لوگوں کا مشورہ ہے' یا پھر وہ محتاجوں میں تقسیم کردوں اور دوسرے بھلائی کے کاموں میں بطور عطیات دے دوں' مگر حدیث میں تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور پاک چیز ہی قبول فرماتا ہے۔ آنجناب محترم سے توقع ہے کہ اس اہم مسئلہ پر راہنمائی فرمائیں کہ میں کیا کروں۔ یہ بہت سارے لوگوں کا نہایت اہم مسئلہ ہے جن کے لاکھوں کروڑوں کے سود کی حرام رقمیں اسی طرح بینکوں میں جمع ہیں اور وہ تائب ہو کر پاکیزگی اختیار کرنا

چاہتے ہیں کہ وہ ایسے گندے مال کو ٹھکانے لگا کر دنیا سے اس طرح رخصت ہوں کہ ان کی توبہ بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو چکی ہو۔

آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دین کی حمایت میں لوگوں کی نفع بخش رہنمائی فرمائے۔ آمین!

جواب

اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ اس محترم بھائی کے قدم حق پر اس طرح جما دے کہ حرام سے ہٹ کر حلال ہی اس کو بالکل کافی ہو جائے اور وہ اطاعت کر کے اللہ کا فضل پائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُمت کی بڑی اکثریت نیکی اور بھلائی کا مزاج رکھتی ہے اور وہ مخالفانہ فتووں اور بے لگام باتوں میں نہیں آتی' جن کے خلاف پہلے ہی علمی مجلسیں اور اسلامی ممالک میں قائم ہونے والی عالمی کمیٹیاں متفق ہیں کہ ایسے تمام منافع سود اور حرام ہیں۔

چنانچہ اس بھائی نے بینک کے جس منافع کے بارے میں دریافت کیا ہے جو اس کے نام پر جمع ہو گیا ہے تو یہ حاصل شدہ مال حرام ہے' اس کا استعمال اس کے لیے جائز نہیں اور اکلِ حرام ہے' خواہ اس کا استعمال کھانے پینے میں ہو یا لباس و رہائش میں ہو' مسلمانوں' غیر مسلموں کے حقوق کی خوشی یا مجبوری سے ادائیگی کے لیے ہو یا ٹیکسوں کی معقول یا ظالمانہ ادائیگی میں' کیونکہ بہرحال اس کو اس کا فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ایندھن کے لیے بھی درست نہیں' اگرچہ بعض دانشوروں کی طرف سے اس کی وکالت کی جائے' یا عوامی بیت الخلاء اور پیشاب خانے تعمیر کرنے میں' جو کہ عجیب سا فتویٰ ہے' کوئی عقل سلیم اسے قبول نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ خرچ کرنے والا اس سے کسی نہ کسی طور فائدہ پالیتا ہے جو کہ مالِ حرام سے ناجائز ہے' اپنے لیے بھی اور اپنے اہل و عیال کے لیے بھی' اِلّا یہ کہ وہ شخص محتاج یا مقروض ہو جائے اور زکوٰۃ کا مستحق قرار پائے۔ لیکن یہ منافع بینکوں کے لیے بھی چھوڑ دینا صحیح نہیں' کیونکہ بینک اس کو لے کر اپنے سودی کاروبار کو مزید بڑھانے اور مضبوط کرنے میں لگائے گا۔ یہ عمل حرام کی مدد اور گناہ کو پھیلانے میں اعانت کا مترادف ہے۔ وضاحت کے لیے ہماری کتاب ''اسلام میں حلال و حرام'' کا مطالعہ کریں۔

اس موقع پر یہ گناہ اور زیادہ بڑا ہو جاتا ہے جب مسلمانوں کے مالدار لوگ اپنی رقمیں غیر ملکی امریکی اور یورپی بینکوں میں چھوڑ دیتے ہیں جو زیادہ افسوس ناک صورت حال ہے' کیونکہ وہ بینک ایسے زائد اموال کو اپنے رفاہی اداروں کی مدد کے لیے بھیج دیتے ہیں' زیادہ تر غیر مسلم مشنری اداروں' گرجاؤں کے لیے' جو زیادہ تر مسلمان ملکوں میں قائم ہیں' جس کا

صاف مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں کا مال ہی مسلمانوں کو عیسائی بنانے' اپنے دین میں فتنہ پردازی کرنے اور اپنے مقصد سے دور کرنے میں استعمال کیا جائے۔

خلاصہ یہی ہوا کہ سودی منافع بینکوں میں چھوڑ دینا' خصوصاً غیروں کے بینکوں میں' قطعاً ناجائز ہے۔ یہ عالمِ اسلامی کی اکثر مجالس کا فیصلہ ہے' خاص طور پر اسلامی مصارف کی کویتی کمیٹی میں طے کر دیا گیا ہے۔ تاہم شرعی مصرف بینکوں کے سودی منافع کا' اور اس طرح کے تمام ناجائز و حرام اموال کا یہی ہے کہ رفاہی کاموں میں صرف ہوں' جیسے محتاج' مساکین' یتامیٰ اور مسافرین۔ نیز راہِ خدا کے جہاد میں' اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں' مساجد اور اسلامی مراکز کی تعمیر میں' مبلغوں اور واعظوں کی تیاری میں اور اسلامی مطبوعات وغیرہ مختلف قسم کے بھلائی کے کاموں میں خرچ کیے جائیں۔

اسلامی تحقیق کی مجلسوں میں اس پر بحث و مذاکرہ ہو چکا ہے اور بعض علماء حضرات اس کے متعلق اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں کہ یہ سودی حرام منافع محتاجوں اور اسلامی رفاہی اداروں کے لیے کیونکر جائز ہو جائے گا جبکہ ہم خود اِس کو خبیث' گندا اور اپنے لیے ناگوار سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مال بذاتِ خود مکروہ اور گندا صرف اس شخص کے لیے ہے جس کے پاس غلط کمائی سے آیا ہے' لیکن یہ محتاجوں اور فلاحی کاموں کے لیے جائز ہے' یعنی کمانے والے کے لیے ناجائز طریقہ ہونے کے سبب حرام ہے' جبکہ مذکورہ فلاحی امور کے لیے صحیح ہے۔ چنانچہ مال بذاتِ خود گندا نہیں' وہ تو خاص سبب اور خاص شخصیت کے اعتبار سے حرام ہوتا ہے۔

اگر اس حرام مال کو خرچ کرنے کے لیے مختلف طریقوں پر غور کیا جائے تو وہ صرف چار ہی ہو سکتے ہیں:

اوّل: کمانے والا یہ مال خود بھی استعمال کرے اور اپنے اہل و عیال پر بھی صرف کرے۔ یہ ناجائز ہے' جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

دوم: یہ مال سودی کاروبار والے بینک میں ہی چھوڑ دیا جائے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ اس کا ذکر بھی گزر چکا۔

سوم: اس مال کو لے کر تلف کر کے ضائع کر دیا جائے۔ یہ مشورہ بعض گزرے ہوئے متقی علماء نے دیا تھا' لیکن امام غزالی نے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں اس کی تردید کی۔ حدیث میں بھی ہے کہ ہمیں مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

چہارم: اس مال کو رفاہی اور فلاحی کاموں میں استعمال کیا جائے' یعنی محتاجوں' مساکین'

یتیموں اور مسافروں کی ضروریات کے لیے' نیز رفاہی اداروں اور اجتماعی دعوت و تبلیغ کے لیے۔ چنانچہ ناجائز طریق پر حاصل ہونے والے مال کا یہی متعین و صحیح مصرف ہے کہ خود کمانے والا بھی گناہ سے محفوظ رہے اور مال صحیح مصرف میں استعمال بھی ہو جائے۔

مناسب ہے کہ یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ یہ عمل صدقہ و خیرات کے طور پر نہیں کیا جائے گا' کیونکہ ''اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور اس کی بارگاہ میں صدقہ بھی پاک ہی قبول کیا جاتا ہے''۔ یہ تو دراصل غلط مال کو صحیح طریقہ پر ایک ہی مصرف میں استعمال کا جواز بیان کرنا مقصود ہے' تاکہ ایسا مال رکھنے والا خود کو صدقہ کرنے والا سمجھنے کے بجائے اس مال کو صحیح بھلائی کے مصرف تک پہنچانے والا بن جائے۔ ویسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کی طرف سے صدقہ کرنے والا ہے جس کا درحقیقت یہ مال ہے اور وہ اس کا مالک ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بینکوں کے یہ منافع دراصل ان قرض داروں کی ملکیت ہیں جو بینک سے اپنی بعض ضرورتوں کے لیے قرض حاصل کرتے ہیں' چنانچہ یہ درحقیقت ان ہی کو ملنے بھی چاہئیں' جبکہ بینک کے ساتھ قرض داری کے معاہدہ کی رو سے وہ اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پھر یہ زائد مال یا منافع صحیح مالک کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بینک میں ہی چھوٹے رہ جاتے ہیں۔

امام ابوحامد غزالی کے نزدیک ایسے اموال جن کے مالک معلوم نہ ہوں یا ان کو دریافت کرنا ممکن نہ ہو کہ ان کو یہ اموال واپس کیے جاسکیں اور حقیقت واضح ہونے تک توقف کو کہا جائے اور عام طور پر بہت سارے مالکوں کی وجہ سے یہ لوٹائے نہ جاسکیں' جیسے مشتبہ قسم کا مالِ غنیمت جمع ہو جاتا ہے' تو ایسے اموال کو اصل نامعلوم مالکوں کی طرف سے صدقہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ امام غزالی نے یہ کہا ہے کہ اس کے بارے میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس مالِ حرام کا صدقہ کیسے ہو جس کا کوئی مالک بھی معلوم نہ ہو؟ اسی وجہ سے ایک جماعت اس صدقہ کو ناجائز کہتی ہے کہ یہ مال حرام ہے۔

صوفی فضیل بن عیاض کی ایک حکایت ہے کہ ان کو جو درہم ملے جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ ایسے ہی ہیں تو انہوں نے وہ پھینک دیئے اور کہا میں صدقہ تو پاکیزہ مال کا ہی کروں گا' کیونکہ جو میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ دوسرے کے لیے کیوں پسند کروں؟ ہمارا کہنا یہ ہوگا کہ ہم نے ان کے خلاف یہ رائے خاص سبب اور معقول احتمال کی وجہ سے اختیار کی ہے۔ یعنی حدیث اور صحابہ کے عمل کے اتباع میں صحیح قیاس کے ساتھ۔ حدیثِ مبارکہ ہے کہ جناب نبی

اکرم ﷺ کو ایک مرتبہ ایک بھنی ہوئی بکری کا گوشت پیش کیا گیا تو جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ حرام ہے تو آپؐ نے اسے صدقہ کر دینے کا حکم دیا۔ اسی طرح اہل روم کی فتح کی جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پیشین گوئی فرمائی تو مشرکین مکہ نے جھٹلایا اور مذاق اڑایا کہ "دیکھو تمہارا صاحب (نبیؐ) کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے! اس کو زعم ہے کہ رومی غالب آ جائیں گے"۔ اس پر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے شرط باندھ لی۔ پھر جب یہ بات سچ ثابت ہوئی او رشرط کا مال حضرت ابوبکرؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس لائے اور آپؐ نے اس کو حرام بتایا تو انہوں نے اس کو صدقہ کر دیا۔ تب ہی شرط لگانے اور جوا کھیلنے کی حرمت نازل ہوئی۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل

۱) جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک کنیز خریدی۔ اس کے مالک کو وقت پر قیمت نہ دے سکے۔ اس نے بعد میں زیادہ طلب کرنا چاہا تو جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی قیمت صدقہ کر دی اور دعا کی "اے اللہ! یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے اگر وہ راضی ہو' ورنہ میری طرف سے صدقہ ہے"۔

۲) حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ مالِ غنیمت میں سے چوری کرنے والے کی توبہ کیسے قبول ہوگی؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ "وہ اسے صدقہ کر دے"۔

۳) ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے کسی موقع پر مالِ غنیمت میں سے سو دینار چوری کر لیے' پھر جب احساس ہوا تو واپس جمع کرانے اپنے سردار کے پاس آیا جس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ اب تو لوگ واپس چلے گئے۔ پھر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ تب وہ کسی اور نیک آدمی سے ملا جس نے مشورہ دیا کہ اس کا پانچواں حصہ امیر معاویہؓ کو (بیت المال کے لیے) دے دو اور باقی صدقہ کر دو۔ یہ بات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو آپؓ نے قبول کر لیا کہ پھر کوئی اندیشہ نہ رہا تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ' حارث محاسبی اور صوفیاء کی ایک جماعت نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔

قیاس یہ ہے کہ یہ مال دراصل ایک تردّد کا شکار ہوتا ہے کہ ضائع کر دیا جائے یا کسی بھلے کام میں صرف کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کے صحیح مالک کا تو علم ہوتا نہیں' تو ضرورت اس بات کی ہے کہ بجائے دریا برد کرنے کے اس کو کسی اچھے مصرف میں لگایا جائے۔ اگر اس کو ضائع کر دیا جائے تو ایسا کرنے سے نہ اپنا فائدہ ہوگا اور نہ مالک کے لیے کوئی اجر ہوگا۔ اور اگر کسی

محتاج کو دے دیں تو وہ جب مالک کے لیے دعا کرے گا تو اس کو برکت نصیب ہوگی اور محتاج کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔ مالک کو تو اجر بلا کسی تکلیف کے ملے گا‘ جسے وہ انکار کے بجائے پسند ہی کرے گا۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ کھیتی کاشت کرنے والے اور بونے والے کو اجر ملتا رہے گا‘ کیونکہ اس کی کھیتی کا فائدہ انسانوں‘ پرندوں اور دیگر جانوروں کو ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کسی کا یہ کہہ دینا کہ صدقہ تو ہمیں پاکیزہ چیز ہی کا کرنا چاہیے‘ اور یہ اسی صورت میں صحیح ہوگا کہ ہم اس کا ثواب چاہیں (اس کا جواب یہ ہے کہ) دراصل ہم تو اس کے بوجھ سے گلوخلاصی چاہتے ہیں‘ کیونکہ یہ تردّد رہتا ہے کہ تلف کر کے ضائع کر دیا جائے یا صدقہ کیا جائے۔ پھر اس کو ہی بہتر خیال کرنا چاہیے کہ ضائع کرنے کے بجائے صدقہ کرنا ہی بہتر ہے (یہ بھی ان شاء اللہ اجر کا موجب ہوگا) اگر کوئی یہ کہے کہ ”جو ہمیں پسند نہیں وہ دوسروں کے لیے کیوں پسند کریں“ تو اس کا بھی یہی جواب ہے‘ کیونکہ وہ ہمارے لیے تو حرام ہے اور ہم اس سے مستغنی ہیں‘ جبکہ محتاج کے لیے دلیل شرعی کی بنا پر حلال ہے۔ مصلحت کا تقاضا بھی جب یہی ہے تو اس کے لیے حلال سمجھنا واجب ٹھہرا۔ چنانچہ ہمیں اس پر مطمئن ہونا چاہیے۔ ہماری رائے یہی ہے کہ جب وہ محتاج اور فقیر ہے تو وہ یہ مال خود اپنے اور اپنے اہل وعیال پر صرف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اہل وعیال اس کی محتاجی کی وجہ سے اس سے غیر متعلق یا دُور نہیں ہو سکتے‘ بلکہ ان پر تو اس کا صدقہ زیادہ ضروری ہے۔ لیکن اسے چاہیے کہ وہ اپنی ضرورت وحاجت کی حد تک ہی خود پر صرف کرے اور کسی دوسرے محتاج کو بھی دے دے تو اچھا ہے۔

اس موقع پر سائل کے ذہن میں یہ سوال بھی آ سکتا ہے کہ بینک کے ان سودی منافع جات کو لے کر فلاحی کاموں میں خرچ کرنے سے کیا اس کو بھی کچھ ثواب ملے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو صدقہ کرنے کا اصل ثواب تو نہیں ملے گا‘ البتہ دو اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ بھی مستحق ثواب قرار پائے گا۔

پہلا سبب: اس حرام مال کے استعمال اور فائدہ اٹھانے سے وہ خود کو ہر طرح بچاتا رہا ہے۔ یہ اس کے لیے باعثِ ثواب ہے۔

دوسرا سبب: وہ ذریعہ بنتا ہے اس زائد مال کو محتاجوں تک پہنچانے کا‘ اور ایسے اسلامی اداروں کو پہنچانے کا بھی جو اس سے فیض یاب ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس محنت کا ثواب بھی ضرور اس کو نصیب ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ واللہ الموفق وھو المستعان۔

(فتاویٰ معاصرہ‘ از ڈاکٹر یوسف القرضاوی)